بصیرت پر دلالت کرتا تھا۔ اس خطبے کے آخر میں انہوں نے اپنے طبقے یعنی متوسط طبقے کی ذہنی و طبقاتی الجھنوں کے تناظر میں اس طبقے کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اگر وہ شرفا کے کوچے سے نکل کر محنت کشوں کے درمیان آئیں اور ان کا طرز عمل دیکھیں تو انہیں اندازہ ہو گا کہ کس طرح یہ طبقہ روایتی اقدار اور تبدیل ہوتی ہوئی اقدار کے درمیان مفاہمت پیدا کر رہا ہے۔ مزدور طبقہ اپنے آپ کو کس طرح جدید سانچے میں ڈھال رہا ہے۔ پرانی اقدار میں سے کچھ اقدار کو برقرار رکھ رہا ہے اور کچھ اقدار کو رد کر رہا ہے۔ جب ڈاکٹر اختر حمید خان یہ نکتہ بیان کر رہے تھے تو مجھے 'وہ اپنی کہنہ سالی کے باوجود ایک جوان' پر عزم اور روشن دماغ انسان نظر آ رہے تھے۔

پروفیسر کرار حسین ملک کے معروف دانشور' ادیب' تہذیب و ادب کے استاد' ماہر تعلیم اور خطیب تھے۔ انہوں نے اپنے علمی تجربے' راست فکری اور روشن خیالی سے کئی نسلوں کو متاثر کیا اور ان کی ذہنی آبیاری کی۔ پروفیسر کرار حسین کی صحبت بجائے خود اکتساب فیض کا ایک زرخیز وسیلہ تھی۔ کئی سال صاحب فراش رہنے کے بعد انہوں نے ۸۸ برس کی عمر میں اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ پروفیسر کرار کا اصل شعبہ انگریزی ادب تھا۔ انہوں نے عملی زندگی کا آغاز میرٹھ کالج میں انگریزی کے استاد کی حیثیت ہی سے کیا۔ قیام پاکستان پر وہ کراچی آئے اور اسلامیہ کالج میں تدریس کا آغاز کیا۔ اس کالج میں وہ پرنسپل بھی بنے۔

۱۹۶۰ء کے عشرے میں وہ گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں پرنسپل مقرر ہوئے اور ۱۹۷۰ء کے عشرے میں بلوچستان یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا منصب ان کے سپرد کیا گیا۔ بلوچستان ان دنوں سیاسی کشیدگی اور بدامنی کا شکار تھا۔ نوجوانوں کے جذبات میں وقتاً فوقتاً آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ ایسے میں صوبے کی واحد جامعہ کا تعلیمی نظم و نسق ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ اس صوبے کے لیے فرزند زمین نہ ہونے کے باوجود کرار حسین بڑی کامیابی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئے۔ وہ سب کے لیے قابل احترام اور ہر کسی کے لیے شفقت کا پیکر تھے۔ ملک کے مختلف علاقوں میں بالعموم اور بلوچستان میں خاص طور سے ان کی مہربان یادیں آج بھی ہزاروں طلبہ و طالبات کے دلوں میں جاگزیں ہیں۔

کرار حسین کی انگریزی کے علاوہ اردو اور فارسی ادبیات پر بھی گہری نظر تھی۔ وہ کلاسیکی اور جدید دونوں طرز کی ادبیات پر دسترس رکھتے تھے۔ گو کرار حسین کا تحریری سرمایہ بہت زیادہ نہیں ہے لیکن جو تحریریں انہوں نے وقتاً فوقتاً سپرد قلم کیں' وہ بھی ان کی علمی قامت کا اندازہ لگانے کے لیے ناکافی نہیں ہیں۔ پروفیسر موصوف کا ذریعہ ابلاغ تحریر سے زیادہ تقریر تھا۔ اس قول صادق کے مصداق کہ "کلام کرو تاکہ

پہچانے جاؤ'' کرار حسین نے بھی کلام کو اپنی شناخت بنایا۔ ان کا انداز گفتگو نرم' دھیما' مگر منطقی اور مدلل تھا۔ وہ مخاطب سے شدید اختلاف بھی انتہائی سلیقے کے ساتھ کر سکتے تھے۔ دل آزاری ان کے مسلک میں گناہ تھی۔

کرار حسین انسانیت کے نغمہ خواں تھے اور ان کا سارا فکری نظام انسان دوستی ہی کے گرد گھومتا تھا۔ وہ اگر مذہبی آدمی تھے تو اس شرح صدر کے بعد کہ مذہب ان کے خیال میں انسان کا نجات دہندہ ہے۔ وہ اگر مذہبی افسرشاہی کے خلاف تھے تو اس لیے کہ یہ ''افسرشاہی'' انسان کے بنیادی جوہر انسانیت کی نفی کرتی ہے اور انسان کے لیے وبال دوش ہے۔ وہ صوفیا کے مسلک کے مطابق ہر کسی سے ربط و تعلق کے موید تھے۔ ان کا اپنا حلقہ احباب کسی ایک مسلک تک محدود نہیں تھا بلکہ ایک ''صلائے عام'' تھی' یاران نکتہ داں کے لیے۔

پروفیسر موصوف فلسفہ و منطق ہی کی دنیا کے سیاح نہیں تھے بلکہ انہوں نے تہذیب و ثقافت اور ادب کے شعبوں میں بھی اپنے افکار سے ایک دنیا کو فیض یاب کیا۔ زبان و ادب اور ثقافت کے حوالے سے ان کے خیالات روشن خیالی کے عکاس تھے۔ یہ خیالات ان کے تعمیری انداز فکر اور مثبت ورلڈ ویو سے مشتق تھے۔

پاکستان اسٹڈی سینٹر' جامعہ کراچی' کے ایک سیمینار میں جو مختلف پاکستانی علاقوں کے ادب اور اردو ادب کے جائزے کے حوالے سے منعقد کیا گیا' انہوں نے مختلف زبانوں کے ادیبوں کے 'اپنی زبانوں کی قدامت پر اصرار کے تناظر میں یہ فکر انگیز نکتہ بیان کیا کہ کسی زبان کا قدیم ہونا بجائے خود اتنے تفاخر کی بات نہیں ہے۔ فخر کی بات تو یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ ہماری زبان جدید کتنی ہے۔ انہوں نے کہا کہ زبان اور ادب کی شروعات پر فخر تو ایسے ہی ہے جیسے ہم انسان کی شروعات پر فخر کرنے لگیں۔ ہم فخر انسان کی ابتدا پر نہیں بلکہ اس کے شباب پر کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں اپنی اپنی زبانوں کے عہد شباب کا تعین کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ہماری زبانوں نے اپنے شباب میں کس پائے کا ادب تخلیق کیا۔

کرار حسین کسی زبان کی ترقی کے لیے دوسری زبانوں کے ساتھ اس کے میل جول کو کلیدی اہمیت دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ''اردو زبان کو اگر رہنا ہے' تو اس کی صورت وہی ہوگی جو امریکہ میں انگریزی زبان کی ترویج سے ہوئی۔ برطانیہ کا انگریزی ادب امریکہ میں جا کر اس پلانٹ ہوا' اب حال یہ ہے کہ کسی امریکی سے اگر کہا جائے کہ تم انگریزی ادب پیدا کر رہے ہو تو وہ برا مان جائے گا۔ وہ تو امریکی ادب پیدا کر رہا ہے۔ یہی صورت پاکستانی اردو ادب کی بھی ہے۔ اردو اسی وقت صحیح معنوں میں قومی زبان بن سکتی ہے جب اس کے

رشتے دوسری پاکستانی زبانوں سے استوار ہوں گے۔"

پروفیسر موصوف علم و ادب اور تحقیق کے میدان میں کسی قوم کی کارکردگی کو اس قوم کی بقا کا اصل ضامن تصور کرتے تھے۔ فیض احمد فیض کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے ایک مرتبہ اس نکتے کی وضاحت یوں کی: "آخر میں بس ایک فقرہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنی سوسائٹی اور اپنی قوم کے لیے بڑی بات یہ دیکھنی ہوتی ہے کہ انسانیت کے لیے اس میں کیا معنی ہیں؟ کیا پیغام ہے اس کے پاس؟ زندگی کا کون سا پیرین اس نے ابھارا ہے؟ اس پیرین کے اندر کتنا حق اور کتنا حسن ہے؟ کم نظر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم یا کسی معاشرے کی جو بقا ہے وہ بہت ساری فوجیں اکٹھی کرنے میں اور بہت سارے ہتھیاروں کو اکٹھا کرنے میں اور بہت سارا مال و دولت اکٹھا کرنے میں ہے۔ میں عرض کروں گا کہ جس وقت قوموں پر زوال آتا ہے تو اس وقت مال و دولت کی کمی نہیں ہوتی بلکہ بہت زیادہ مال و دولت ہوتا ہے۔ ہندوستان پر جب غیروں کا قبضہ ہوا۔ اس وقت اسے سونے کی چڑیا کہا کرتے تھے۔ اس کے خزانوں کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ نہ آدمیوں کی کمی ہوتی ہے نہ سپاہیوں کی اور نہ ہی سپاہیوں کے اندر ہمت کی کمی ہوتی ہے۔ ہمت بھی بہت ان کے اندر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں جہاں بھی جنگیں ہوئیں وہاں ہمارے بزرگ جو لڑ رہے تھے وہ بزدل نہیں تھے۔ مگر جب کسی معاشرے کے پاس دنیا کے لیے اور انسانیت کے لیے کوئی پیغام نہیں رہتا جب اس کے اندر سے Living Word بلند نہیں ہوتا جب اس کے اندر سے کوئی زندہ لفظ بلند نہیں ہوتا تو وہ قوم حرف غلط کی طرح مٹا دی جاتی ہے اور فیض صاحب وہ شاعر ہیں جنھوں نے ہمیں زندہ لفظ دیا۔ فیض زندہ لفظ کے شاعر ہیں۔"

پروفیسر غلام مصطفیٰ شاہ، ڈاکٹر اختر حمید اور پروفیسر کرار حسین تینوں ہی ہمارے دانشور اور سماجی و فکری رہنما تھے۔ آج ہم جن بزرگوں سے محروم ہونے پر دل گرفتہ ہیں ان کے ذاتی دوست بھی بہت ہوں گے مگر یہ تینوں محبان وطن تھے۔ اپنے معاشرے اور اس کے باشندوں کے مونس و غم خوار تھے۔ اس تعلق کے حوالے سے سوچیں تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان تینوں بزرگوں کی یاد کو کتنا پھیلنا چاہیے اور اس پھیلاؤ میں کس قدر مسائل کے ادراک اور کتنی کاوشوں کے عزم کو سمٹ آنا چاہیے۔

☆☆☆